تبصرۂ کتب

مصنف : محمد امین زبیری
مبصر : سیّد نظر زیدی

خدوخالِ اقبالؒ پر ایک نظر

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اس لحاظ سے یقیناً بہت خوش نصیب ہیں کہ اُن کی زندگی ہی میں اُن کی شاعرانہ عظمت اور اعلیٰ فکری صلاحیتوں کا اعتراف کر لیا گیا تھا اور پھر اُن کے مداحوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی نہیں ہے کہ کسی نے اُن کے فکر و فن پر حرف گیری کی ہی نہ ہو۔ یہ سلسلہ بھی اُن کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا اور اب تک جاری ہے۔

شاید ہمیشہ سے یونہی ہوتا آیا ہے کہ جب کوئی شخص اپنی خاص اہلیتوں اور جہد و سعی کے باعث عام سطح سے اُبھرتا ہے تو اُس کے مداحوں کے ساتھ نکتہ چیں بھی لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ ہمیشہ حسد اور ایسی ہی کسی اور نفسیاتی کمزوری کے باعث نہیں ہوتی بلکہ اس کا محرک جذبہ خیر بھی ہوتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بڑے سے بڑا عبقری بھی کمزوریوں اور خامیوں سے بالکل پاک نہیں ہوتا۔ انسان کی یہ حیثیت ہے ہی نہیں کہ اس کی ذات اور اس کے فکر کے سبھی پہلو تابناک ہوں۔ بشری کمزوریوں کے باعث اُس سے کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی کوئی لغزش ہوتی ہے اور دردمند نقاد اس کمزوری کی نشاندہی کر کے گویا اُس پر ایک طرح احسان کرتا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک بہت ہی افسوسناک بات یہ بھی ہے کہ بعض لوگ محض حسد یا کسی نوعیت کے تعصب میں مبتلا ہو کر بھی تنقید و تبصرے کے نام سے دل میں چھپی نفرتوں اور جوش مارتے ہوئے غصّے کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے شکار کی خوبیوں کو نظر انداز کر کے بہت کوشش سے خامیاں تلاش کرتے ہیں اور اُن کے انبار لگاتے چلے جاتے ہیں، بلکہ بعض اوقات تو یوں بھی ہوتا ہے کہ اپنی کج فہمی کے باعث خوبیوں کو خامیوں کے خانے میں ڈالنے پر اصرار کرتے ہیں۔

حضرت علامہ اقبالؒ کے اس دوسری قسم کے ایک نقاد کا کارنامہ کتابی صورت میں انہی دنوں منظرِ عام پر

آیا ہے۔ یہ مرحوم محمد امین زبیری کی کتاب "خدوخال اقبال" ہے۔ بقول ناشر یہ کتاب اس کی تاریخ اشاعت سے تقریباً تیس برس پہلے لکھی گئی تھی، لیکن مصنف کی زندگی میں طبع نہ ہو سکی اور یہ شرف اسے اب حاصل ہوا ہے۔ "خدوخال اقبال" کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۷۵ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ کتاب $\frac{18 \times 22}{8}$ سائز کے ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اصل موضوع کے علاوہ اس میں مصنف کے خاندان، اُن کی زندگی اور تصنیفی کارناموں کا ذکر بھی شامل کیا گیا ہے۔

اگرچہ مصنف کا دعویٰ یہ ہے کہ انھوں نے اقبالؒ کے اُن مداحوں کا پول کھولا ہے جو اپنے ممدوح کی مدح و ستائش میں بہت مبالغہ کر رہے ہیں، لیکن کتاب کے ابتدائی اوراق کا مطالعہ کرتے ہوئے ہی یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ حضرت ایک منصف مزاج نقاد کی طرح اقبالؒ کی شخصیت اور ان کے کلام پر اظہار خیال نہیں کر رہے بلکہ انہیں بہرحال ایک معمولی آدمی اور ایک معمولی شاعر ثابت کرنے کے لیے میدان میں اُترے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب ایک شخص خاص رنگ کے شیشوں کی عینک لگا کر چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے تو پھر ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔

اس کتاب کے بارے میں سب سے پہلا سوال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جب اقبالؒ ایک متنازعہ شخصیت نہیں ہیں۔ انہیں بطور ایک شاعر اور بطور مسلمان فلسفی عالمگیر شہرت حاصل ہو چکی ہے، اُن کی مخالفت کرنے اور انہیں ایک معمولی، بلکہ معمولی سے بھی کسی قدر کم درجے کا آدمی ثابت کرنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ اور کیا اس کاوشِ بے جا کا کوئی نتیجہ بھی مرتب ہو سکتا ہے؟

اس سوال کا درست جواب یقیناً یہی ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اللہ پاک نے اقبالؒ کو مقبولیت عام اور شہرت دوام کا جو درجہ عطا فرما دیا ہے اسے کسی طرح بھی گھٹایا نہیں جا سکتا۔ اُن کے خلاف کچھ کہنا تو چاند پر تھوکنے کے مترادف ہے اور سب جانتے ہیں چاند پر تھوکا منہ پر آتا ہے، چنانچہ اس کتاب کے فاضل مصنف کی اپنی شخصیت نامعتبر ہو گئی ہے۔ ان کے قلم سے نکلی ہوئی ابتدائی سطریں پڑھ کر ہی صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُن کی حیثیت ادب اور شعر کو عیوب اور کمزوریوں سے پاک دیکھنے کی خواہش رکھنے والے نقاد کی نہیں، بلکہ وہ نکتہ چینوں کے اُس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو مختلف وجوہ سے اقبالؒ اور اُن کے پیغام کے سخت مخالف ہیں۔

اقبال کی مخالفت:

عام مطالعے کے مطابق یہ گروہ شروع سے ان تین ٹولوں پر مشتمل رہا ہے:

۱۔ وہ ملادین جو مذہب کو تاریک خیالی اور توہم پرستی کی علامت خیال کرتے ہیں۔ اقبالؒ چونکہ ابتدا ہی سے ملّتِ اسلامیہ کے نقیب اور احیائے اسلام کے داعی تھے، اس لیے اس گروہ نے اُن کے خلاف محاذ بنایا اور

All rights reserved

اُن کی ذات اور اُن کے کلام کو معمولی ثابت کرنے کے لیے پورا پورا زور لگا دیا۔ بہت آگے چل کر انہوں نے ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف بھی کیا تو یہ پخ لگا کر کہ وہ ایک سیکولر شاعر تھے۔

۲۔ وہ لوگ جو اُردو ادب کے ایک بڑے فتنے "اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان" میں مبتلا ہو کر اقبالؒ کے کلام میں ایطائے جلی اور ایطائے خفی قسم کی خامیاں تلاش کرتے تھے۔ یاد رہے ایک زمانے میں یہ فتنہ اتنا قوی تھا کہ اگر ایک طرف اقبالؒ جیسے شاعر کو معمولی اور غلط گو ثابت کرنے پر زور صرف کیا جاتا تھا تو دوسری طرف لاہور میں حسرت موہانی جیسے بزرگ شاعر کو کرسی سے گرا دیا گیا تھا اور علامہ تاجور جیسے غیر متعصب اور اردو شاعری کے عظیم سرپرست کے خلاف محاذ قائم کر لیا گیا تھا اور ان کے اس سارے کام کو برباد کر دیا گیا جو وہ اردو ادب کے انتخاب کے سلسلے میں کر رہے تھے۔

۳۔ برادرانِ وطن کا وہ طبقہ جو اندھے تعصب میں مبتلا ہو کر فیصلہ کر چکا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ کسی عظمت کا ذکر آنے ہی نہ دے گا۔

۴۔ اور اب ایک چوتھا گروہ اُن حضرات کا ہے جو مسئلہ قومیت کے سلسلے میں اقبالؒ اور مولانا حسین احمد مدنی کے اختلاف کے بعد معرضِ عمل ہوا ہے۔ ان لوگوں کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں اور انہوں نے باقاعدہ کوئی محاذ بھی قائم نہیں کیا لیکن وہ انفرادی طور پر یہ کوشش ضرور کر رہے ہیں کہ اقبالؒ کو ایک معمولی آدمی ثابت کر کے اپنے مرشد کا انتقام لیں۔

بہرحال اس تجزیے کو قیاس بھی قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن اس بات سے تو انکار ممکن ہی نہیں کہ ادب اور شعر کی دنیا میں جیسے ہی اقبالؒ کا قد بلند ہوا اُن کی مخالفت کا آغاز ہو گیا، کسی نے ان کے کلام میں زبان اور عروض کی غلطیاں تلاش کیں، کسی نے تضادات کا سراغ لگایا، کوئی انہیں ایک بے عمل آدمی ثابت کرنے پر تُل گیا۔ کسی نے اُن کی گھریلو زندگی کو موضوعِ سخن بنایا اور کوئی عطیہ فیضی سے اُن کے فرضی معاشقے کی داستان نمک مرچ لگا کر بیان کرتا رہا۔

ان سب الزامات کا الگ الگ جواب دینا ممکن تو ہے، لیکن یہ تبصرہ اس طوالت کا متحمل نہ ہو سکے گا، اس لیے مختصر طور پر ہی کچھ عرض کرنا مناسب ہے اور اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ فاضل نقاد نے بحث کی بنیاد ہی ایک غلط تصور پر رکھی ہے۔ انہوں نے جتنے بھی اعتراضات اٹھائے ہیں وہ اس مفروضے پر ہیں کہ حضرت علامہ اقبالؒ کو ان کے مداحوں نے ایک مافوق الفطرت اور معصوم عن الخطا شخصیت قرار دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت علامہ کے بعض مداحوں نے کسی قدر غیر محتاط رویہ اختیار کیا ہے اور کچھ جملے ایسے لکھ دیے ہیں جو حدِ اعتدال سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، ورنہ صحیح صورت حال یہ ہے کہ ان کے تمام سنجیدہ مزاج مداحوں اور منصف مزاج نقادوں نے انہیں ویسا ہی مانا ہے جیسے کہ وہ تھے، یعنی نہ وہ پیغمبر تھے، نہ مجدد،

بلکہ ایک مسلمان فلسفی اور باکمال شاعر تھے۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ اپنی ان دونوں حیثیتوں میں وہ اپنے دور کے تمام فلسفیوں اور تمام شاعروں سے بہت اونچا مقام رکھتے تھے اور ان کی یہ خوبی دیگر خوبیوں کے علاوہ تھی کہ انہیں اپنی ملّت کے مسائل سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا اور انہوں نے احیائے دین کی تمنا کو اس طرح اپنے دل میں بسالیا تھا کہ اس کے سوا کسی اور تمنا کی ان کے دل میں گنجائش ہی نہ رہی تھی۔

اس کے علاوہ دوسری بات جسے "خدوخالِ اقبال" کے فاضل مصنّف نے نظر انداز کردیا ہے یہ ہے کہ اقبالؒ کے علم، فکر اور نظریات کا ارتقا فطری تدریج کے ساتھ ہوا ہے۔ وہ اپنی ابتدائی زندگی ہی میں وہ کچھ نہ بن گئے تھے جو آج نظر آتے ہیں۔ اور یہ صرف حضرت علاّمہ اقبال ہی کا معاملہ نہیں، بلکہ انبیاء کے گروہ کو مستثنیٰ کرکے تمام انسان سیڑھی سیڑھی چڑھ کر ہی اپنے مرتبے کو پہنچتے ہیں، بلکہ علم اور وجدان کا مسئلہ تو اس عام فطری عمل سے بھی کچھ مختلف ہے۔ بعض حضرات تو بوڑھے ہوکر بھی ان نعمتوں سے محروم رہتے ہیں۔

اس نقطۂ نظر سے یہ بات کسی طرح بھی موزوں نہیں کہ حضرت علاّمہ اقبالؒ کو عام بشری اور فطری کمزوریوں سے مبرا دیکھنے کی خواہش کی جائے اور طالب علم اقبال کو بھی مفکرِ اسلام، حکیم الامت علاّمہ اقبالؒ کے معیار پر پرکھنے کے لیے اصرار کیا جائے۔ یہ مطالبہ بذاتِ خود فہم کی کجی ہے۔ اگر اقبالؒ نے ایک زمانے میں حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہوکر ہمالہ، ترانۂ ہندی اور سوامی رام تیرتھ جیسی نظمیں لکھیں اور ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

لکھنے کے بعد ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

لکھ کر اپنے ملّی اور دینی جذبات کا اظہار کیا اور پھر اسی سمت آگے بڑھتے ہوئے اسلام کے پرجوش شاعر اور ملّت کے دردمند مفکّر بن گئے تو یہ ان کے افکار و نظریات کا تضاد نہ تھا، بلکہ فکر و شعور کا ارتقا تھا۔

عیب جو اور نکتہ چیں تو یقیناً اس بات پر اصرار کرے گا کہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں نظم و ضبط کے ساتھ کوئی ایک نظریہ پیش نہیں کیا، بلکہ رنگارنگ باتیں کہتے چلے گئے ہیں، لہٰذا ان کے کلام میں کھلا تضاد ہے، لیکن ایک ذی شعور شخص لازمی طور پر اس حقیقت کو ملحوظ رکھے گا کہ کسی بھی انسان کی شخصیت یکایک زمین سے نہیں اُگ آتی، بلکہ ایک نظم اور ایک تدریج کے ساتھ نشو و نما پاتی ہے اور اس کے کردار و افکار و نظریات کا تعیّن اس وقت ہوتا ہے جب وہ پودے سے کامل درخت کی حیثیت پاکر پھل دینے لگتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ انسان پتھر کی طرح بے حس اور بے حرکت نہیں ہوتا کہ

اُسے جس رُخ رکھ دیا جائے اس پر رکھا رہتا ہے اور اس پر جو رنگ لگا دیا جائے اُس میں رنگا جاتا ہے۔ بلکہ انسان تو ایک تغیر پذیر، متحرک اور حالات کا اثر قبول کرنے والی زندہ مخلوق ہے اور اثر قبول کرنے کے سلسلے میں اس کا یہ حال ہے کہ بعض اوقات تو ایک لمحے کے بعد دوسرے لمحے ہی اس کی ذہنی فضا پہلی سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ بالخصوص شاعروں کی یہ حس تو بہت ہی قوی ہوتی ہے کہ اُن کی اصل پر نبی اُن کے جذبات ہی ہوتے ہیں، تاہم اس رنگا رنگ ذہنی فضا میں چپکے چپکے انسان کی اصل شخصیت کی تعمیر کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ تقریباً یوں جیسے اپنے مدار پر گردش کرتے ہوئے سورج کی ایک حرکت دن رات بناتی اور دوسری گردش ماہ و سال تخلیق کرتی ہے۔

انسان کے اندر کا یہ انسان اگرچہ خاندانی اور نسلی ورثے اور ظاہری علم و اعمال کے اثرات ہی سے نشوونما پاتا ہے، لیکن اپنے افکار اور اپنے نظریات میں ایک الگ ہی شخصیت ہوتا ہے اور دراصل یہی وہ پیکر ہوتا ہے جس کی مناسبت سے کارزارِ حیات میں اُس کا مقام متعین ہوتا ہے، چنانچہ اس نقطۂ نظر سے اقبالؒ کے اندر بیٹھا ہوا ایک اور اقبالؒ بھی تھا اور وہ شروع ہی سے ہو بہو اُسی اقبالؒ جیسا تھا جسے آج مفکرِ اسلام اور حکیم الامت اقبالؒ کہا جاتا ہے۔

ماحول کے اثرات اور فطری تقاضوں کے مطابق حضرت علامہ اقبالؒ کے کلام میں بے شک خاصی رنگا رنگی ہے۔ وہ کبھی خارزاروں میں اور کبھی گلزاروں میں سفر کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن اُن کے اسی کلام میں بین السطور وہ پیغام اور وہ لہجہ بھی چھپا ہوا ہے جس نے انہیں عظمت اور مقبولیت کے اس مقامِ بلند تک پہنچایا۔ وہ پیغام ہے توحید و رسالت کی عظمتوں کے سچے اعتراف کا، اور وہ لہجہ ہے ملّتِ اسلامیہ کے دکھوں میں شریک رہنے والے ایک دردمند مسلمان کا!

اقبالؒ کی اس عظمت اور اس خوبی کا پوری طرح اُس وقت اندازہ ہوتا ہے جب اُن کے ہم مرتبہ اور ہم عصر مغربی دانشوروں کے افکار اور نظریات کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور اس بات پر غور کیا جائے کہ اُن کے ادب نے وہاں کس قسم کا معاشرہ پیدا کیا اور اقبالؒ کے پیغام نے ہمارے گم کردہ راہ قافلے کو کس طرح منزلِ مراد کے قریب کر دیا۔

یہ دعویٰ کرنا یقیناً غلط ہوگا کہ آج ہم آزادی، خوشحالی اور احیائے دین کے لیے جدوجہد کے جن مرحلوں میں ہیں وہ محض اقبالؒ ہی کے کلام کا فیض ہے، لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمیں یہ برکتیں بڑی حد تک اپنے اسی شاعر اور مفکر کی آہِ سحرگاہی کے نتیجے ہی میں حاصل ہوئی ہیں۔

ہندوستان کی مغل سلطنت کی تباہی کے بعد جب انگریز اس ملک کی قسمت کے مالک بنے تو انہوں نے انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب کو رائج کرنے پر بھرپور توجہ دی۔ اپنی قومی انا کے باعث ہندوستانی مسلمانوں

نے اگرچہ اپنی طرف سے بہت کوشش کی کہ اس بدرنگی کا شکار نہ ہوں، لیکن حملہ اس قدر شدید تھا اور حالات اتنے بدل چکے تھے کہ انہیں ہار ماننی پڑی۔ رفتہ رفتہ اُن کی خاصی بڑی تعداد کے پیر اکھڑ گئے اور وہ اس غیر ملکی حکومت کے ثقافتی کیمپوں میں آباد ہو گئی۔

ان حالات میں بات یہاں آکر ٹھہر گئی تھی کہ کس طرح اُن مسلمانوں کو اُن کی ملّت کے تاریک مستقبل سے آگاہ کیا جائے جو کم گھروں میں پلے تھے اور جنہیں اپنی ملّت کی عظمت کا کچھ احساس ہی نہ رہا تھا۔ ایسے تاریک دَور میں سیالکوٹ کے نور محمد کشمیری کا وہ فرزند دلبند ایک عزم بلند اور جذبۂ تازہ کے ساتھ ملّت کی مسیحائی کے لیے میدانِ عمل میں اُترا جس نے دینی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ولایت جا کر اہلِ یورپ کے علوم بھی پڑھے۔

ہندوستان میں ملّت اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کا آغاز یقیناً بہت سی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے بہت سی آنکھوں سے آنسو بہے ہیں اور بہت سے قلب بریاں ہوتے ہیں، لیکن اس بات میں ذرا بھی شک نہیں کرنا چاہیے کہ بیداری کی یہ زبردست لہر اقبالؒ کے افکار نے تیز تر کی جس کے نتیجے میں انگریز زدہ مسلمانوں کا اپنی حالت پر مطمئن رہنا محال ہو گیا اور یہ اقبالؒ کا اتنا بڑا احسان ہے کہ اسے بُھلا دینا احسان فراموشی کی بدترین مثال ہو گی۔

”خدوخال اقبال“ کے مصنف کی غلط فہمی

حضرت علامہ اقبالؒ کی شخصیت کے حقیقی خدوخال اجاگر کرنے کی اس حقیر کوشش کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ امین زبیری صاحب نے جو اعتراضات اٹھائے ہیں اُن کے بارے میں کچھ کہا جائے۔

اس کتاب میں زبیری صاحب نے اپنے طور پر حضرت علامہ اقبالؒ کی ذات میں یہ کمزوریاں تلاش کی ہیں:

۱۔ عطیہ فیضی سے جو خط و کتابت ہوئی اس سے اقبالؒ کے کردار کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔

۲۔ اقبال نے اپنے کلام میں ملوک و سلاطین کی مذمت کی ہے، لیکن اپنی عملی زندگی میں وہ ملوک و سلاطین کے مداح رہے۔

۳۔ اپنی خانگی زندگی میں اقبالؒ ایک معمولی آدمی تھے۔

۴۔ اقبالؒ نے مسلم لیگ کی تحریک میں کوئی حصّہ نہیں لیا اور نہ وہ نظریۂ پاکستان کے خالق تھے۔

۵۔ اقبالؒ کے افکار و نظریات میں تضاد تھا اور وہ اُن لوگوں سے بھی مخلص نہ تھے زبان و قلم سے جن کی مدح کرتے تھے۔

ان الزامات میں اس لحاظ سے تو کوئی نیا پن نہیں کہ اس قسم کی باتیں پہلے بھی اکثر لوگ کرتے رہے، لیکن انہیں یکجا اور مربوط انداز میں شائع کرنا ضرور نئی بات ہے اور اسی لیے یہ قابلِ توجہ بھی ہیں۔

اس سلسلے میں بات تو یہ محسوس ہوتی ہے کہ ان میں اچھا خاصا عنصر الزام تراشی کا ہے۔ امین زبیری صاحب نے حضرت علامہؒ کی پوری زندگی کے تناظر میں واقعات پر بحث نہیں کی بلکہ اپنی پسند کی کچھ باتیں چُن کر اُن کی من پسند تاویل کی ہے۔ اس اندازِ تنقید کی ایک مثال واضح ہو۔ حضرت علامہ کے محترم استاد مولوی سید میر حسن کو ایک معمولی آدمی ثابت کرنے کے لیے لکھتے ہیں:

"۱۸۷۷ء میں ایم اے او کالج فاؤنڈیشن میں حضرت مولانا بھی تشریف لے گئے تھے۔ سر سید نے وائسرائے کے اعزاز میں ایک بہت بڑا ڈنر دیا۔ شاہ صاحب کو بھی مدعو کیا، لیکن آپ نے کہا کہ میں ایسی دعوتوں میں شریک نہیں ہو سکتا، چنانچہ سر سید نے اپنے فرزند سید محمود کے ہاتھ کھانا بھیجا اور کہا کہ جب تک شاہ صاحب کھانا کھائیں اُن کی خدمت میں حاضر رہنا اور اُن کی باتیں سُننا۔"

امین صاحب اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بظاہر کس قدر صاف روایت ہے، مگر اب ذرا تنقید کا انداز ملاحظہ کیجیے:

مولانا نے نہ ایسی باتوں کی تصریح کی، نہ مجبوری ظاہر کی، بلکہ ایک اکھڑ جواب دیا۔ حالانکہ مولانا سر سید کے بڑے ارادت مند تھے اور سر سید عمر میں اُن سے بہت بڑے اور مرتبہ میں اُن سے بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وائسرائے کے ڈنر میں مغربی طریق پر کھانا ہو گا اور مولانا چھری کانٹے کے استعمال میں مشاق نہ ہوں گے اس لیے بہتر طریقہ یہ تھا کہ ادب کے ساتھ معذرت کر لیتے۔[۱۵]

آپ نے دیکھا کہ ایک سادہ واقعے کو فاضل نقاد نے کیسا گھٹیا مفہوم دیا! بالکل درست بات تو یہ تھی کہ ایک بزرگ عالمِ دین اور غیرت مند مسلمان کے اس مسلک کی تعریف کی جاتی کہ اُس نے اُس انگریز حاکم کے ڈنر میں شرکت نہ کی جس کی قوم نے مکر و فریب کے ذریعے مسلمانوں سے ہندوستان کی حکومت چھینی تھی لیکن انہیں اس انکار کی یہ مضحکہ خیز وجہ معلوم ہوتی ہے کہ مولانا چھری کانٹے کا استعمال نہ جانتے تھے، اس لیے ڈنر میں شریک ہونے سے انکار کر کے اپنا یہ "گناہ" چھپایا۔

ایسی ہی ایک مثال:

"اقبالؒ کا انتقال درحقیقت ایک سانحہ عالمگیر تھا، مُسلم دنیا ہی نہیں، بلکہ پوری دنیا ایک متاعِ گرانمایہ سے محروم ہو گئی، لیکن ان کے ایک عقیدت مند حمید احمد

خاں صاحب نے ایک عجیب مجہول بیان پیش کیا:

"اقبال ؒ کی وفات پر لاہور کے ایک مقتدر انگریز افسر نے اقبال کے ایک عقیدت مند سے کہا کہ آج تم نے ہندوستان کے آخری مسلمان کو سپردِ خاک کر دیا۔"

یہ مقتدر مگر مجہول انگریز تو انگریز ہی تھا، لیکن یہ عقیدت مند بزرگ تو مسلمان تھے، کیا ان کو اپنی نسبت بھی یقین ہوا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔

گویا ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہندوستان میں صرف ایک ہی مسلمان رہ گیا تھا، سو اُس کو بھی سپردِ خاک کر دیا گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون" [۱۲]

آپ نے دیکھا اس فاضل نقاد نے اقبال ؒ کے مرتبے کا ادراک رکھنے والے انگریز کے اس جملے کا کیا مفہوم اخذ کیا کہ:

"تم نے ہندوستان کے آخری مسلمان کو سپردِ خاک کر دیا۔"

یعنی ان حضرت کے نزدیک مذکورہ انگریز نے یہ کہا کہ پورے ہندوستان میں اقبال ؒ کی صورت میں بس ایک ہی مسلمان موجود تھا اور اس کی وفات کے بعد اب ہندوستان میں کوئی مسلمان باقی نہیں رہا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

زبان کی چاشنی اور نزاکتوں سے معمولی آشنائی رکھنے والا ایک غیر ادیب شخص بھی پروفیسر حمید احمد خان صاحب کی عبارت پڑھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ انگریز دانشور نے وہی کچھ کہا تھا جو جناب امین زبیری نے کمال حسین مبالغے کے رنگ میں اُس نے تو واضح طور پر یہ کہا تھا کہ اقبال ایک عظیم مسلمان تھا جسے آج سپردِ خاک کر دیا گیا۔

تیسری مثال:

سکھ مذہب کے بانی بابا گورو نانک کے بارے میں اقبال ؒ نے لکھا ہے ؎

بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
اور ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

فٹ نوٹ میں ان اشعار پر امین زبیری صاحب نے یوں تبصرہ فرمایا ہے:

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں توحید گورو نانک نے پھیلائی نویں اور دسویں صدی سے قبل شرک ہی شرک تھا۔"

ان شعروں سے یہ مطلب کشید کرنا کہ اقبالؒ نے گورو نانک کو ہند میں توحید کا بانی قرار دیا ہے بڑی ہی افسوسناک بات ہے۔ پہلے شعر کے پہلے مصرع سے بغیر کسی دشواری کے یہ مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ ہند کے ہندو معاشرے میں، یعنی بتکدے میں بابا گورو نانک کے وجود سے پھر توحید کی روشنی پھیلی۔ اور یہ بات تاریخی اعتبار سے بالکل درست ہے۔ بابا گورو نانک ایک ہندو کھتری کے گھر پیدا ہوئے، لیکن انہوں نے اپنے آبائی عقائد اپنانے کے بجائے عقیدۂ توحید کو اپنایا اور اس مقدس عقیدے کو نہ صرف ذاتی طور پر اپنایا بلکہ اپنے اس معاشرے میں جو قرنہا قرن سے بت پرست چلا آ رہا تھا ہم خیال لوگوں کی ایک جماعت پیدا کر لی۔

جو مفہوم محترم زبیری صاحب نے پیدا کیا ہے وہ تو اقبالؒ کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔ اور اس بات کا ثبوت حضرت علامہؒ کا وہ شعر ہے جو "خود و خال اقبال" ہی میں بالکل متصل صفحے پر درج کیا گیا ہے اور جو بابا گورو نانگ ہی کی شان میں ہے یہ دراصل حضرت علامہ کی نظم ہندوستانی بچوں کا قومی گیت کے پہلے بند کا پہلا شعر ہے۔ موصوف نے پورا بند درج نہیں کیا ایک شعر حذف کر دیا ہے۔ بند یہ ہے ؎

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے، میرا

اس بند کے پہلے شعر سے اس بات کی بخوبی تردید ہوتی ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ گورو نانک کو ہندوستان میں توحید کا بانی مانتے تھے۔ اُن کا مسلک تو یہ ہے اور بالکل درست ہے کہ ایک ہندو کھتری کے گھر پیدا ہونے والے اس خدا رسیدہ شخص نے بُت خانۂ ہند میں توحید کے نغمات گائے۔ اس کے پیرو اگرچہ آگے چل کر اپنی اصل کی طرف لوٹ گئے اور اپنے گورو کی کتاب گرنتھ کو بُت بنا لیا اور اس کے آگے سجدہ ریز ہو گئے، لیکن اس بات میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ گورو نانک کی تعلیم خالص خدا پرستی کی تھی۔

دوسرے مذاہب کے بزرگوں کی مدح:

محترم محمد امین زبیری صاحب نے حضرت علامہ اقبالؒ پر ایک اعتراض یہ بھی عاید کیا ہے کہ انہوں نے گورو نانک کے علاوہ ہندوؤں کے اوتاروں، رام چندر جی، سری کرشن اور گوتم بدھ کی بھی مدح کی ہے، بادی النظر میں یہ بات واقعی عجیب لگتی ہے کہ عظمت اسلام کے ترانے سنانے والا شاعر اور مفکرِ اسلام کہلانے والا

فلسفی غیر مسلم قوموں کے رہنماؤں کی تعریف و توصیف میں بھی زورِ بیان صرف کرے، لیکن یہ بات اُس وقت تک عجیب لگتی ہے جب تک اس پر موجودہ سیاسی فضا میں غور کیا جائے اور عام جذباتی رویّہ برقرار رکھا جائے ورنہ اصل بات تو یہ ہے کہ حضرت علامہ کا یہ کلام ان کے اسی مسلک کا ترجمان ہے جس کے باعث انہیں یہ عظمت ملی ہے۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ رویّہ روحِ اسلام کے عین مطابق ہے۔ اسلام کوئی ایسا دین نہیں ہے جس کی بنیاد رنگ و نسل کی تفریق اور اوطان و ملل سے نفرت پر رکھی گئی ہو، بلکہ یہ تو وہ الہامی دین ہے جو تمام انسانوں کو ایک ماں اور ایک باپ کی اولاد تسلیم کرتا اور بھلائی کے متلاشی تمام انسانوں کو ایک ہی قبیلے کے افراد بتاتا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں اس مضمون کی متعدد آیات موجود ہیں جن میں زمانوں کے بُعد کو نظر انداز کر کے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء و رسل کو ایک ہی دعوت کے داعی بتایا گیا ہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے غیر صرف کُفر ہے۔

دیگر اعتراضات:

محترم امین زبیری صاحب نے حضرت علامہ پر جو فردِ جرم عائد کی ہے اس میں حسبِ توقع عطیہ فیضی سے خط و کتابت کا "جرم" سرِ فہرست ہے۔ "خدوخالِ اقبال" کے تعارف نگار جناب انیس شاہ جیلانی نے تو پیش گفت کا آغاز ہی اس جملے سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اقبال بے حد وجیہہ انسان تھے۔ شخصیت ایسی جاذبِ نظر تھی کہ ہر شخص کھنچا چلا آتا تھا۔ جی میں عطیہ فیضی کی شخصیت نمایاں ترین ہے جو حسن و جمال اور علم و ہنر کا پیکر تھیں۔" [۳]

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے عطیہ اور اقبالؒ دونوں کے حسین و جمیل اور عالم فاضل ہونے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ لازمی طور پر عشق کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہی نقطۂ نظر زبیری صاحب اور اُن دیگر حضرات کا ہے جنہوں نے اقبالؒ اور عطیہ فیضی کے بارے میں افسانہ طراز یاں کی ہیں۔

اس امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بشری کمزوریوں کے باعث بہت متقی اشخاص بھی کسی وقت حدِ اعتدال سے ہٹ سکتے ہیں، لیکن حضرت علامہ اقبالؒ کے بارے میں یہ بات بہت اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ خدا کے فضل سے ان کے خیالات میں معمولی سی کمزوری بھی پیدا نہیں ہوئی۔ اُن کے اور عطیہ فیضی کے مابین جو خط و کتابت ہوتی اُس کی حیثیت دو ہمعصر اور بڑی حد تک ہم خیال تعلیمیافتہ شخصیتوں کے

درمیان ہونے والی مراسلت سے ذرا بھی مختلف نہیں۔

علیہ کی شبلیؒ نعمانی اور اقبالؒ سے جو خط و کتابت ہوتی اُس میں تہذیب و شرافت سے گری ہوئی ایک بات بھی مرقوم نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کی علمی وجاہت اور شخصی عظمتوں کا اعتراف کیا گیا ہے اور اس تعلقِ خاطر کی بنا پر جو بے تکلفی ان کے مابین پیدا ہو گئی تھی اُس کی مناسبت سے کچھ ذاتی مسائل بھی زیرِ بحث آ گئے ہیں۔ معترضین کو یہ سب باتیں اس لیے بہت عجیب لگیں کہ وہ جس معاشرے میں زندگی گزار رہے تھے اس میں منکوحہ بیوی بھی اپنے شوہر کو خط نہ لکھ سکتی تھی، خط لکھنا تو بڑی بات ہے وہ تو شوہر کا نام بھی زبان پر نہ لا سکتی تھی۔ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر بھی اُس کا شوہر اس کے لیے "اے جی" یا "منّے کے ابّا" ہی رہتا تھا۔ ان حضرات کو یہ خط و کتابت عجیب، بلکہ معیوب نہ لگتی تو عجیب بات ہوتی، چنانچہ انہوں نے حیرت اور تعجب کا اظہار کیا اور ساتھ ہی اپنی عیب جو طبع کی بنا پر ان سے یہ لغزش بھی سرزد ہو گئی کہ انہوں نے آوارہ مزاجی کا پہلو بھی تلاش کر لیا۔

اقبالؒ کی گھریلو زندگی:

امین زبیری صاحب نے اپنی اس کتاب میں حضرت علامہ کی گھریلو زندگی پر بھی بحث کی ہے اور اس بات کو اُن کا بہت بڑا گناہ بتایا ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی بیوی سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔ اوّل تو یہی بات شرافت سے گری ہوئی ہے کہ کسی بھی شخص کی بالکل ذاتی اور گھریلو زندگی کو زیرِ بحث لایا جائے۔ وجہ یہ کہ جب میاں بیوی میں اختلاف پیدا ہوتا ہے تو ساری ہی باتیں سطح پر نہیں آ جاتیں۔ اکثر تو یہ بگاڑ پسند نہ آنے والے رویّے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور رویّہ ایک ایسی چیز ہے کہ صرف سمجھا جا سکتا ہے، کسی اور کو سمجھایا نہیں جا سکتا۔ علاوہ ازیں یہ بگاڑ ہمیشہ مردوں کے غلط کردار ہی کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتا، کبھی عورت بھی قصوروار ہوتی ہے۔ (یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ خدانخواستہ حضرت علامہ کی پہلی بیوی کی ذات زیرِ بحث نہیں آئی، انسانی معاشرے کی ایک عام خرابی کی طرف اشارہ کیا گیا۔) اور تیسری بات یہ کہ ہمارے دین اسلام کی رو سے میاں بیوی کا علیٰحدگی اختیار کر لینا کوئی ایسا جرم نہیں کہ ایسا کرنے والوں کے کردار کو مشکوک قرار دے دیا جائے۔ حالات سازگار نہ رہیں اور دونوں محسوس کریں کہ ان کا یکجا رہنا باعثِ آزار ہوگا تو شریعت نے مرد کو طلاق دینے کا اور عورت کو خُلع حاصل کرنے کا اختیار دیا ہے اور دونوں طبقے اپنا یہ حق استعمال کرتے رہے ہیں۔ یہاں بھی دراصل ہمارے غیر اسلامی ذہن ہی نے اس معاملے کو ایک سنگین مقدمہ بنا دیا ہے۔ غیر مسلم اقوام میں شادی کا یہی تصوّر ہے کہ یہ رشتہ ایک بار استوار ہو جائے تو پھر کسی صورت میں منقطع نہیں ہوتا، لیکن اسلام انسانی فطرت کے تقاضوں اور تمدن کی ضرورتوں کے مطابق عائلی تعلقات کی استواری اور نشو و نما کی

اجازت دیتا ہے۔

اس نقطہ نظر سے یہ بات ایسی ہرگز نہ تھی کہ اسے اقبالؒ کے کبیرہ گناہوں میں شامل کیا جاتا اور کتابوں میں اس پر بحث کی جاتی۔ یہ بحث تو صاف طور پر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ معترض بہرحال علامہ اقبالؒ کو ایک معمولی آدمی ثابت کرنے پر تُلے ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کے دور دراز گوشوں میں نظر آنے والی کمزوریاں بھی زیادہ سے زیادہ بڑی کر کے دکھانے پر آمادہ رہتے ہیں۔

اقبالؒ کی شاہ پرستی؟

امین زبیری صاحب نے حضرت علامہ پر ایک الزام یہ بھی لگایا ہے کہ انہوں نے ایک طرف خودی کا درس دیا اور دوسری طرف امرا اور سلاطین کی شان میں قصیدے لکھے۔ زبیری صاحب کے علاوہ اور لوگوں نے بھی یہ الزام لگایا ہے، بالخصوص کمیونسٹوں کے نزدیک تو حضرت علامہ کا یہ "گناہ" ان کے سب گناہوں سے سنگین تھا۔ بظاہر یہ بات درست بھی لگتی ہے۔ شاعری کی اصطلاح میں یہ تو بہت بڑا اشتر گربہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ معترضین نے جس بات کو علامہ کا گناہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ اپنی اصل میں اُن کی ایک نمایاں خوبی ہے۔

اس سلسلے میں توجہ طلب بات یہ ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ نے امرا کی شان میں قصائد کیوں لکھے؟ کیا دنیا کمانے کے لیے؟ اس سوال کا جواب خود زبیری صاحب نے یہ دیا ہے کہ انہیں ایسا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ "خدوخالِ اقبال" میں انہوں نے یہ بات ایک سے زیادہ مقامات پر لکھی ہے اور اپنے انداز میں طعنہ دیا ہے کہ انہیں کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ ملاحظہ ہو:

والیٔ افغانستان، نادر شاہ سے علامہ اقبالؒ کی عقیدت کی روداد رقم کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> "اس مہمانی میں علامہ اقبال کے ساتھ کسی مابہ الامتیاز برتاؤ کا اور نہ اس "ہدیۂ فقر" کے تشکر کا کوئی اشارہ ملتا ہے جو کہانی میں مذکور ہے۔ نادر نے ان مہمانوں کو جو تحائف دیے وہ بھی یکساں مالیت کے تھے۔"[۴]

ریاست حیدرآباد دکن کے وزیراعظم سرکشن پرشاد شاد سے حضرت علامہ کی عقیدت کا مفصل ذکر کرنے اور طرفین کے خطوط سے اقتباسات درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> "سرکشن پرشاد اور اقبالؒ کی مراسلت کا سلسلہ جاری رہا، لیکن کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کشن پرشاد نے اپنے اس طویل زمانہ وزارت میں اقبالؒ کی کیا خدمت کی اور کس امید کو پورا کیا!"[۵]

گویا زبیری صاحب نے صاف اعتراف کیا ہے کہ شاہانِ افغانستان کی مدح سرائی کا کچھ صلہ اقبالؒ کو ملا اور نہ سرکشن پرشاد جیسے بااختیار امیر کی تعریف و توصیف کے بدلے کوئی فائدہ حاصل ہوا۔ یقیناً صورتِ حال یہی رہی اور اسی وجہ سے رہی کہ اقبالؒ نے کسی مالی فائدے کی تمنا ہی نہ کی تھی۔ اگر وہ اس سمت میں ادنیٰ سی کوشش بھی کرتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ کامیاب نہ ہوتے۔ خوشامد تو وہ ہتھیار ہے جس کی ضرب کبھی بے اثر رہتی ہی نہیں۔ خود محمد امین زبیری صاحب نے نواب بھوپال سے وظیفہ حاصل کر لیا تھا جو انہیں تاحیات ملتا رہا۔ اقبال کے دل میں ایسی تمنا ہوتی تو کیا وہ کامیاب نہ ہوتے!!

ہوا دراصل یہ ہے کہ حضرت اقبالؒ نے جس وجہ سے یہ رویہ اختیار کیا اُس کی طرف ان کے نقادوں کی نگاہ گئی ہی نہیں۔ اور اُن کی نگاہ اس بلندی تک جا ہی نہیں سکتی تھی۔ سیپیاں اور گھونگے تلاش کرنے والا شخص ابرِ نیساں کا تصور کس طرح کر سکتا ہے!

حضرت اقبالؒ کی اس دانائی کا جسے اُن کے نادان نقادوں نے ایک عیب ثابت کرنے کی کوشش کی صحیح حال جاننے کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ اُس زمانے کے اُن سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل پر غور کیا جائے جن سے ہندوستانی مسلمان دوچار تھے۔ مثلاً اُن کے سامنے ایک بہت بڑا مسئلہ انگریز کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا تھا۔ دوسرا مسئلہ اقتصادی بدحالی کا تھا جس کے اثرات اُن کے دینی طبقوں تک پہنچ رہے تھے اور اسی طرح کے اور بہت سے مسائل تھے۔

اقبالؒ پر اللہ نے خاص فضل یہ فرمایا تھا کہ افکار و نظریات کی مختلف منزلوں سے گزرتے ہوئے وہ اپنی عملی زندگی کے بالکل آغاز ہی میں اُس مقام پر ٹھہر گئے تھے جہاں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور مسلمانوں کی سربلندی کے سوا کوئی اور بات ذہن میں آتی ہی نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اہم مقصد صرف تصوّر کی دنیا آباد کرنے سے حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے حصول کا قابلِ عمل اور بہترین طریقہ یہ تھا کہ بااثر لوگوں کو ہم خیال بنایا جائے اور جو ہم خیال ہیں اُن کا اعتماد حاصل کیا جائے، چنانچہ حضرت علامہ اقبالؒ نے یہی کیا۔

سرکشن پرشاد اور اقبالؒ

مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ اور اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے روابط کے سلسلے میں "خدوخالِ اقبال" میں جو مواد شائع کیا گیا ہے اُس میں البتہ چند باتیں ایسی ضرور ہیں جو حضرت علامہ اقبالؒ کے مقام و مرتبے کے مطابق معلوم نہیں ہوتیں۔ مثال کے طور پر حضرت علامہ کی طرف سے لکھے گئے خطوط میں سورۂ فاتحہ کے الفاظ کا بے محل اور بالکل غیر ضروری طور پر استعمال۔ اقبال کی تو خیر شان ہی بڑی تھی، یہ انداز تو ایک عام مسلمان کے عقیدے اور ایمان کے خلاف بھی معلوم ہوتا ہے اور اس لیے یہ گمان گزرتا ہے کہ ان خطوط کے سلسلے میں کچھ گڑبڑ ضرور ہوئی ہے۔ یہ بات قطعاً ناقابلِ یقین

ہے کہ اقبالؒ جیسا شخص جو سرتاپا عشقِ رسولؐ اور حُبِّ اسلام میں ڈوبا ہوا تھا اپنے قلم سے اس قسم کے مہمل جملے لکھ سکتا ہے؛

"اللہ اکبر سے دوچار روز ہوئے ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کا بھی تذکرہ ہوا تھا۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین کا دور دورہ پھر ہو جائے گا۔ مطمئن رہیے گا۔"[۹۶]

حضرت علامہ کے جس خط کا اقتباس اوپر درج کیا گیا ہے اُسی میں آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے؛

"آج کل لاہور میں سلطان کی سرائے میں ایک مجذوب نے بہت سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ کسی روز اُن کی خدمت میں بھی جانے کا قصد ہے۔ شاد کا پیغام بھی پہنچاؤں گا۔"[۹۷]

سلطان کی سرائے کے مجذوب ایک دوسرے کو خطاب کرتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کرتے تھے جو اقبال نے اپنے خطوط میں ان ہی کے حوالے سے نقل کر دیے ہیں یہ اقبال کے الفاظ نہیں بلکہ ان مجذوبوں اور ان کے کلمات کا حوالہ ہے جو امین صاحب کو سمجھ نہیں آیا۔ مہاراجہ کشن پرشاد ان مجذوبوں کا عقیدت مند تھا اور اقبال کے ذریعے ان سے دعا کا خواستگار رہتا تھا۔ یہ مراسلت اسی سلسلے میں تھی۔

اقبال اور کشمیر؛

محترم امین زبیری صاحب نے حضرت علامہ اقبالؒ پر ایک اعتراض یہ بھی کیا ہے کہ؛

"انہوں نے اپنے کشمیری الاصل ہونے پر تو فخر کیا ہے، لیکن کشمیریوں کے مفاد میں اُن کا سہی عمل ہے کہ وہ انجمن کشمیری مسلماناں کے جنرل سیکرٹری تھے یا انہوں نے چند ربا عیاں لکھ دی تھیں۔"

دوسرے اعتراضات کی طرح یہ اعتراض بھی اُن کے ادھورے مطالعے اور خاص نقطۂ نظر قائم کر لینے کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اقبالؒ سیاسی لیڈروں کی حیثیت کے ایک سیاسی لیڈر نہ تھے کہ آزادیٔ کشمیر کی تحریک میں شروع سے آخر تک اُن کا نام نمایاں رہتا۔ وہ تو اصلاً ایک مسلمان فلسفی اور ملّتِ اسلامیہ کا گہرا درد رکھنے والے شاعر تھے۔ اللہ پاک نے اپنی خاص رحمت سے جس خدمت پر مامور کیا تھا وہ یہ تھی کہ برصغیر کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگائیں، فرنگ کے سامری کا طلسم توڑیں اور ملّتِ اسلامیہ کو عمل پر آمادہ کریں اور یہ فرض انہوں نے پوری لگن اور دلسوزی کے ساتھ انجام دیا۔

ڈوگرہ استبداد کے باعث کشمیر کے مسلمان اور بھی مظلوم تھے اس لیے حضرت علامہ کی توجہ اُن کی طرف نسبتاً زیادہ رہی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بالکل ابتدائی زمانے ہی میں وہ کشمیری مسلمانوں میں ذہنی بیداری پیدا کرنے کی تحریک میں شامل ہو گئے اور تادمِ آخر اپنا یہ فرض ادا کرتے رہے۔ اس سلسلے میں اس بات سے بھی اتفاق کیا جا

سکتا ہے کہ اُن کی یہ توجہ اُن کے کشمیری الاصل ہونے کے باعث بھی تھی۔ یہ عصبیت ہر انسان میں فطری طور پر موجود ہوتی ہے اور اسے مسعود و محمود سمجھا جاتا ہے۔ حُبِّ وطن اور حُبِّ قوم وغیرہ اسی کے نام ہیں۔

امین زبیری صاحب کا مطالعہ تو یہ ہے کہ کشمیر کے لیے اقبالؒ کے صرف دو ہی کام ہیں۔ ایک انجمن کشمیری مسلماناں کے جنرل سیکرٹری کا عہدہ قبول کرنا اور دوسرا چند رباعیاں لکھ دینا جو "ذکرِ اقبال" کے مرتب نے بطورِ نمونہ پیش کی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کشمیر کی پوری تحریکِ آزادی میں اقبالؒ کی آواز ایک تسلسل کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔ کشمیر کی سیاسی جماعتوں مُسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کی تشکیل سے بہت پہلے اور شیخ عبداللہ اور چودھری غلام عباس مرحوم جیسے رہنماؤں کے منظرِ عام پر آنے سے بہت پہلے آزادیٔ کشمیر کی تحریک شروع کی گئی تھی اور اس کا ہیڈ کوارٹر پنجاب میں تھا۔ منشی محمد دین فوقؔ، مولانا علم الدین سالک، مولانا محمد عبداللہ قریشی اور دیگر حضرات سیاحوں کی حیثیت سے کشمیر جاتے تھے اور اپنی پُر اثر تقریروں سے کشمیریوں کو یہ احساس دلاتے تھے کہ اگر وہ ہاتھ پاؤں ہلائیں تو اُن کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر کا روزنامہ انقلاب لاہور کشمیر اور اہلِ کشمیر کے بارے میں خاص اہتمام سے مضامین اور خبریں شائع کرتا تھا۔ اقبالؒ بھی آزادیٔ کشمیر کے ان اوّلیں نقیبوں میں شامل تھے، بلکہ "اقبال اور کشمیر" کے مصنف ڈاکٹر صابر آفاقی صاحب کے بقول تو یہ شعلہ بیدار ہی افکارِ اقبالؒ سے ہوا۔

صابر صاحب کا بیان ہے:

> "ساقی نامہ" (فارسی) کے ذریعے علامہؒ نے کشمیریوں میں احساسِ خودی اور جذبۂ انفرادیت پیدا کیا۔ رئیس احمد جعفری کے بقول کشمیر کی غلامی، کشمیریوں کی مظلومی اور تباہ حالی، مگر ان بلتے کی دراز دستی اور سفاکی، کوہستانِ کشمیر میں مسلم اکثریت کی پامالی اور ہندو اقلیت کی فرماں روائی، یہ وہ حوادث تھے جنھوں نے اقبالؒ کے دل کا خون کر دیا تھا۔ علامہ نے اسی جذبہ و احساس کے تحت "ساقی نامہ" لکھا تھا۔ "ساقی نامہ" علامہ نے ۱۹۲۱ء کے جون کے آواخر اور جولائی کے اوائل میں سرینگر کے نشاط باغ میں لکھا۔ یہ شہ کار "پیامِ مشرق" میں شامل کیا گیا جو ۱۹۲۳ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔"

صابر صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں:

> "چنانچہ پیامِ مشرق کے طبع ہونے کے ایک ہی سال بعد ۱۹۲۴ء میں کشمیر میں ریشم سازی کے کارخانے میں بغاوت ہوئی اور یہ نیم جان مموے شاہباز سے لڑ گئے۔"[۵]

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ڈوگرہ استبداد کے پنجے میں گرفتار خفتہ بخت کشمیری مسلمانوں میں بیداری کی پہلی لہر حضرت علامہ اقبالؒ کے کلام ہی سے پیدا ہوئی۔

امین زبیری صاحب کے اس خیال کو "ڈاکٹر صابر آفاقی کی تصنیف "اقبال اور کشمیر" مکمل طور پر رد کرتی ہے۔

اقبال اور نظریۂ پاکستان:

"خدوخالِ اقبال" کے محترم مصنف نے یہ بات بہت زور دے کر لکھی ہے کہ اقبالؒ کو تصورِ پاکستان کا خالق کہنا غلط ہے، کیونکہ اُن سے پہلے بہت سے مسلمان مفکر یہ بات لکھ چکے تھے کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل کا بہترین حل یہ ہے کہ اس ملک کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اُن میں انہیں قوتِ حاکمہ تسلیم کیا جائے۔ یہ نام شاید اُن سے بھی کچھ زیادہ ہی ہیں جتنے زبیری صاحب نے اپنی کتاب میں درج کیے ہیں، لیکن حضرت علامہ اقبال کو جو اعزاز حاصل ہوا وہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک تصور کو ایک باقاعدہ منصوبے کی شکل دی اور مسلمانوں کی ایک ایسی سیاسی جماعت کے پلیٹ فارم سے پیش کیا جو ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کی جنگ لڑ رہی تھی، اور ایسے وقت پیش کیا جب مسلمانوں اور غیر مسلموں کے سیاسی حقوق کا تصفیہ ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس ذیل میں ان کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے خطبات، بیانات اور خطوط میں اس نظریے کی اس طرح تکرار اور تشریح کی کہ مسلمانوں کے اعلیٰ سیاسی حلقوں نے اسے ایک تحریک کے طور پر قبول کر لیا۔ یہاں تک کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں قائداعظم کی قیادت میں اقبال کے تصورات کو ہی پاکستان کی قرارداد کی اساس کے طور پر تسلیم کیا گیا اور برصغیر کے مسلمانوں نے یہ طے کر لیا کہ اس ملک میں ایک آزاد اسلامی مملکت کا قیام ہی اُن کا مقصدِ حیات ہے۔

اقبال۔ گاندھی جی اور جواہر لال نہرو:

محامین زبیری نے "خدوخالِ اقبال" میں ایک بہت ہی دلچسپ پہلو یہ اختیار کیا ہے کہ علامہ اقبالؒ، گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے مداح اور قدردان تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے کتاب کے صفحہ نمبر ۱۶۰ پر ذکرِ اقبال کے حوالے سے حضرت علامہ کے وہ شعر نقل کیے ہیں جن میں حضرت علامہ نے گاندھی جی کی تعریف کی ہے، اسی طرح صفحہ نمبر ۱۶۰ - ۱۶۱ پر فارسی زبان کے وہ شعر درج فرماتے ہیں جن میں پنڈت جواہر لال نہرو کی قابلیت اور حریت پرستی کا اعتراف کیا گیا ہے۔

یہ اشعار نقل کرنے سے موصوف کا مطلب تو غالباً اقبالؒ کی ذات سے ایک اور تضاد منسوب کرنا اور یہ دکھانا ہے کہ جن ہندو لیڈروں سے مسلمان قوم اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہی تھی، علامہ ان کی مدح و ستائش میں مصروف تھے۔ لیکن وہ اپنے اس مقصد میں اس لیے کامیاب نہ ہو سکے کہ انہوں نے ان اشعار کی تصنیف کا زمانہ نہیں بتایا۔

پھر کسی ایک شخص کی ایک آدھ خوبی کا اعتراف اس بات کی دلیل نہیں کہ علامہ نے اس کی پوری فکر کو ہی اپنا لیا ہے۔

زمانے کا تعین اس لیے ضروری تھا کہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں کئی موڑ ایسے آتے ہیں جب مسلم اور غیر مسلم زعماء نے بہت خلوص کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کی اور اس لگن میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ سوامی شردھانند جیسے شخص کو جو آگے چل کر شدھی اور سنگھٹن جیسی مسلم آزار تحریکوں کا قائد بنا مسجد کے منبر پر لا بٹھایا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک تھال میں کھانا کھایا اور ایک سبیل سے پانی پیا۔ چنانچہ ارکان یہی ہے کہ حضرت علامہ نے بھی اس ضرورت کا احساس کیا اور اپنے اشعار میں ان دونوں ہندو لیڈروں کی تعریف کی۔

اس کے علاوہ ایک اور بات یہ بھی تو ہے کہ ان دونوں حضرات کی حب الوطنی اور آزادی کی لگن ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا تھی اور وہ اپنے معمولات میں بھی بہت معزز تھے۔ اگر مسلمانوں سے اُن کا کوئی اختلاف تھا تو سیاسی نظریات اور اُن کی اس خواہش کے باعث تھا کہ وہ سوراج کے نام پر رام راج قائم کرنے کا عزم کیے ہوتے تھے۔ اور اُن کی یہ حیثیت بھی حضرت علامہ اقبالؒ کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھی۔ ان ہندو رہنماؤں کے بارے میں اُن کے خیالات کیا تھے، اس کا اندازہ اُن کے اس بیان سے بخوبی ہو جاتا ہے جو ۱۹۳۷ء میں اُس وقت دیا گیا جب پنڈت نہرو نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہندوستان میں صرف دو فریق ہیں ایک کانگرس اور دوسرا حکومت۔ اور یہ کہ پورے ملک کی نمائندگی صرف آل انڈیا کانگرس کرتی ہے۔ پنڈت جی کے اس بیان کے جواب میں علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

> "میرے دل میں پنڈت نہرو کی بہت عزت ہے۔ انہوں نے آزادیٔ وطن کی خاطر جو مصائب برداشت کیے ہیں اور قربانیاں گوارا کی ہیں میں اُن کی قدر کرتا ہوں، لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انہوں نے بلاوجہ مسٹر جناح کے ساتھ اُلجھنے کی کوشش کی ہے۔ مسٹر جناح آج مسلمانوں کے سب سے بڑے اور سب سے معتمد علیہ لیڈر ہیں۔ انہوں نے اپنے ملک کی جو خدمت کی ہے وہ کسی اور لیڈر سے کم نہیں، لیکن مسٹر جناح تخیل کی دنیا میں پرواز کرنے کی بجائے حقیقت بینی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی لیے اُن کی قوم پرستی اور حب الوطنی حقائق و واقعات کے صحیح تجزیے پر مبنی ہے۔ مجھے امید ہے کہ پنڈت نہرو کو جلد اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ مسٹر جناح مسلمانوں میں کتنی بلند حیثیت اور ارفع مقام کے مالک ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے اگر کسی شخص کو بات کرنے کا حق ہے تو وہ صرف مسٹر جناح ہیں۔"[۹]

اس اقتباس سے نہ صرف یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صفِ اول کے ہندو لیڈروں کے بارے میں حضرت علامہ کے خیالات کیا تھے، بلکہ محترمی امین زبیری صاحب کے اس اعتراض کا بھی جواب مل جاتا ہے کہ:

"علامہ کو قائداعظم کی سیاست سے عرصہ تک اتفاق اور لگاؤ نہ تھا"[۱]

اس میں شک نہیں کہ قومی تحریک کے دوران میں حضرت علامہ اقبالؒ اور حضرت قائداعظمؒ کے مابین بعض معاملات میں اختلاف ہوا، لیکن یہ اختلاف ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور ایک دوسرے کی اہلیتوں کا انکار کرنے کے لیے نہ تھا، بلکہ اور بہتر نتائج حاصل کرنے کے لیے تھا۔

اختلافِ رائے کے بارے میں احمقانہ تصور تو یہ ہے کہ اس کا سبب لازمی طور پر برتری کا احساس ہی ہوتا ہے، چنانچہ اسی لیے بعض لوگ اس بات سے چڑ جاتے ہیں کہ اُن کی رائے کے بعد بھی کوئی شخص اپنی رائے ظاہر کرے، لیکن دانشمند اپنے تمام کام باہمی مشورے سے انجام دیتے ہیں اور مشورے میں اختلافِ رائے ناگزیر ہے۔ جو لوگ بے چون وچرا انگوٹھا لگانے پر آمادہ رہتے ہیں وہ یا تو خوشامدی ہوتے ہیں یا احمق۔ اسی طرح جن حضرات کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اُن کی جُنبشِ لب کے ساتھ سر ہلائیں پرلے درجے کے نادان ہوتے ہیں، اس نقطۂ نظر سے اگر حضرت علامہ اقبالؒ اور حضرت قائداعظمؒ کے مابین بعض امور میں اختلافِ رائے ہوا تو یہ ان دونوں بزرگوں کی عظمت اور دانشمندی کا ثبوت ہے۔

اقبالؒ کی شاعری:

ان حضرت نے جن کا اسمِ گرامی محمد امین زبیری ہے اپنی اس کتاب میں سب سے زیادہ عجیب حرکت یہ فرمائی ہے کہ حضرت علامہ اقبال کی شاعری پر حرف گیری کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"ایک بزرگ مولوی بشیر الحق دسنوی نے ایک مستقل رسالہ میں اُن اصلاحات کو جمع کر دیا ہے جو علامہ نے اشاعتِ اول کے بعد اپنے کلام میں کیں۔ مولوی عبدالسلام ندوی اس کی تمہید میں لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر اقبال کی شاعری پر ابتدا ہی سے یہ اعتراض ہوتا رہا ہے کہ اُن کے کلام میں بہت سی لفظی غلطیاں پائی جاتی ہیں اس لیے وہ ہمیشہ اپنے کلام میں حک و اصلاح کرتے رہتے ہیں اور اُن کے مجموعۂ مکاتیب سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے کلام کو نظرِ ثانی کے بعد چھپوایا۔"[۲]

اگر ادب مانع نہ ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ شاعری کی پوری تاریخ میں شاید اس سے زیادہ احمقانہ اعتراض کسی نقاد نے کسی شاعر پر نہ کیا ہوگا! سوال کیا جا سکتا ہے کہ بجز الہامی کلام کے کیا کوئی اور کلام بھی ایسا ہے جسے

اصلاح اور ترمیم و تنسیخ سے مبرا قرار دیا جا سکے۔ بالخصوص شاعری میں تو نظرِ ثانی اور نوک پلک سنوارنے کی ضرورت بہرحال ہوتی ہے۔ اسی ضرورت کے تحت استادی، شاگردی کا رشتہ قائم کیا جاتا ہے اور قدیم زمانے سے یہ روایت چلی آ رہی ہے، بہت قابل اور نامور شاعروں نے بھی کسی نہ کسی کے سامنے زانوئے ادب ضرور تہہ کیا۔ خود حضرت علامہ اقبالؒ نے داغ دہلوی کو استاد تسلیم کیا تھا۔

حضرت علامہ کا یہ تعلق تو خیر ایک رسم نبھانے کی حد تک ہی تھا۔ انہوں نے خط لکھ کر حضرتِ داغ کو اُستاد تسلیم کیا اور محترم استاد نے بذریعہ ڈاک ہی اُن کی چند غزلوں پر اصلاح دی، ورنہ اس سلسلے میں عام صورتِ حال تو یہ رہتی ہے کہ استاد اپنے شاگرد کے اشعار کے کچھ الفاظ تبدیل کر کے انہیں زیادہ پُر اثر بناتا ہے۔ کبھی خامیوں کی نشاندہی کر کے شاگرد کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ دوبارہ کوشش کرے، بلکہ بعض اوقات تو اپنی طرف سے ایک آدھ مصرع بھی عطا کر دیتا ہے۔

اس کے علاوہ اپنے کلام پر نظرِ ثانی کرنے کی روایت بھی عام ہے۔ مثال کے طور پر مرزا اسد اللہ غالب کو لیجیے، ان کے بارے میں یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ انہوں نے اپنے دوستوں کا مشورہ قبول کر کے اپنا انداز اور اسلوب بدلا۔ مشکل گوئی ترک کر کے آسان اور سلیس زبان میں شعر کہنے شروع کیے اور جب کلام مرتب کرنے کا مرحلہ آیا تو صرف منتخب اشعار ہی اپنے دیوان میں شامل کیے۔ چنانچہ آج ہمارے سامنے غالب کا جو کلام ہے وہ اُن کا کُل کلام نہیں، بلکہ اُن کے کلام کا خلاصہ اور انتخاب ہے۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے اگر اپنے کلام میں کچھ تبدیلیاں کیں، یا ہنگامی حالات کے تحت لکھی گئی کچھ چیزوں کو اپنے منتخب کلام میں شامل نہ کیا تو اسے اُن کا گناہ یا کمزوری کس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے بارے میں تو یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ وہ اپنے دوستوں سر شیخ عبد القادر اور مولانا گرامی کے مشورے کھلے دل سے قبول کر لیا کرتے تھے۔ رہ گئیں زبان کی غلطیاں تو اس کی تردید کے لیے حضرت علامہ کا مطبوعہ کلام کافی ہے۔ کون ہے جو کلامِ اقبال کی فصاحت و بلاغت کا انکار کر سکے۔ اس سلسلے میں اگر ایک آدھ بات کی نشاندہی کی بھی جائے تو اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا جائے گا۔ بول چال کی زبان کے علاوہ ہماری تحریری زبان پر بھی علاقائی اثرات مسلمات میں سے ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں جو فرق ہے اُس سے کون واقف نہیں۔ پھر پنجاب کو جس کے علامہ اقبالؒ فرزندِ جلیل ہیں اس حق سے کیونکر محروم کیا جا سکتا ہے کہ وہ کہیں کہیں محاورے اور الفاظ کے تلفظ میں اختلاف کرے! اقبالؒ کے کلام کا اصل جوہر تو اُس میں پوشیدہ پیغام اور اس کی اثر آفرینی ہے۔

اقبال کی حقیقی حیثیت یہی ہے کہ وہ گوشت پوست کے ایک ایسے انسان تھے جو فطری طور پر بشری کمزوریوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ ہاں یہ بات بالکل درست ہے کہ وہ ایک عام انسان بھی نہ تھے۔ اللہ پاک نے اپنے خاص فضل سے انہیں خاص صلاحیتیں عطا کی تھیں اور خاص نعمتوں سے نوازا تھا اور ان میں سب سے بڑی نعمت یہ تھی

کہ ان کا دل اور ان کا دماغ حبِ اسلام کے نور سے منوّر ہو گیا تھا ۔

یہ بات کسی مبالغے کے بغیر ہے کہ اپنی علمی وجاہت اور ذہنی صلاحیتوں کے بَل بوتے پر وہ دربارِ سرکار میں بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کر سکتے تھے، امین زبیری صاحب نے تو یہ لکھا ہے کہ وہ حیدر آباد دکن میں جج کا عہدہ حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے، لیکن اُن کا یہ خیال درست نہیں، اگر وہ دنیا کمانے کی طرف راغب ہو جاتے تو انگریزی سرکار میں اُن کے لیے عہدوں کی کمی نہ تھی ۔

انسان ہونے کی حیثیت سے وہ وسائلِ حیات فراہم کرنے پر مجبور تھے، لیکن وہ یہ وسائل اپنی شرطوں پر حاصل کرنا چاہتے تھے ۔ غیر مشروط وفاداری اُن کی فطرت کے لیے قابلِ قبول تھی ہی نہیں ۔ وہ غیر مشروط طور پر وفادار تھے تو صرف اسلام اور ملّتِ اسلامیہ کے ۔ چنانچہ امین زبیری کی اس کتاب کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ان کی عیب جُو فطرت نے انصاف کی بجائے ظلم کا رستہ اختیار کیا ہے اور اقبال جیسے انسان سے اپنے ایّام بھوپال کے کسی واقعہ کے سلسلے میں پرورش پانے والے بغض و عناد کو خدوخالِ اقبال میں انڈیل دیا ہے اور چُٹکی سے پکڑ پکڑ کر اقبال کی سیرت میں کیڑے ڈالتے ہیں خود وہ نہ تو اس قابل تھے کہ اقبال کی شخصیت کا تجزیہ کر سکیں اور نہ وہ اقبال کے فکر و شعر کا فہم و ادراک رکھتے تھے بس موصوف نے محض حسد یا ناموری کی خاطر ایسے سفلے پن کا اظہار کیا ہے جس کی نظیر علمی، فکری، شعری اور سوانحی دنیا میں صرف اور صرف ان کے اپنے ہاں ہی موجود ہے ۔

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹُوٹنا جس کا مقدّر ہو، یہ وہ گوہر نہیں!

حکیم مِری نواؤں کا راز کیا جانے
وَرائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں!

○

All rights reserved

ACADEMY PAKISTAN
LIBRARY
Acc. No. 17093
LAHORE

حوالہ جات:

۱۔ خدوخالِ اقبال ص ۱۷۱
۲۔ خدوخالِ اقبال ص ۱۷۵
۳۔ خدوخالِ اقبال ص ۷
۴۔ خدوخالِ اقبال ص ۷۱
۵۔ خدوخالِ اقبال ص ۶۰
۶۔ خدوخالِ اقبال ص ۵۲
۷۔ خدوخالِ اقبال ص ۵۲
۸۔ اقبال اور کشمیر ص ۶۴-۶۵
۹۔ اقبال اور قائدِ اعظم ص ۷۹
۱۰۔ خدوخالِ اقبال ص ۱۶۱
۱۱۔ خدوخالِ اقبال ص ۱۰۸-۱۰۹

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006

خُدا تجھے کسی طُوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں!
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تُو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں!

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006